پاکستان ہائی کمیشن لندن

تحریر: سہیل احمد لون

کسی ملک میں سفارت خانے کے قیام کا بنیادی مقصد میزبان ملک کے ساتھ سفارت کاروں اور سرکاری عملے کی مدد سے مواصلات کے ذریعے دونوں ممالک کے تعلقات بہتر بنانا، غیر ملکی لوگوں کو ویزا کی سہولت فراہم کرنا، اپنے ملک سے آئے لوگوں کی سرکاری دستاویزات مثلاً پاسپورٹ یا شناختی کارڈ کا اجراء ، کاغذات کو قانونی حیثیت دینے کے لیے تصدیق کرنا، بعض اوقات کسی معاملے میں سرکاری یا حکومتی موقف دینا، ملکی نمائندگی کرنے والے کھلاڑیوں، فنکاروں، طالب علموں، تاجروں کے علاوہ عام لوگوں کی سرکاری سطح پر مدد کرنا ہوتا ہے۔ کسی ملک میں سفارت خانہ اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ دونوں ممالک کے آپس میں تعلقات بہتر ہیں۔ کیوبا اور ایران میں امریکہ کا سفارت خانہ موجود نہ ہونا ان ممالک کے آپس میں خراب تعلقات کی نشاندہی کرتا ہے، پاکستان سمیت جن ممالک میں اسرائیل کا سفارت خانہ نہیں وہ اس بات کی علامت ہیں کہ اسرائیل کے وجود کو انہوں نے قبول نہیں کیا۔ یعنی کسی ملک میں سفارت خانہ بند ہو جانا یا قائم ہی نہ کرنا دونوں ممالک کے سفارتی تعلقات کی کشیدگی کی انتہاء کو ظاہر کرتے ہیں۔ کونسلر سروسز کے علاوہ سفارت خانے اپنے ملک کے تجارتی اور اقتصادی مفادات کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔ مقامی باشندوں اور اپنے ملک سے آ کر آباد ہوئے لوگوں کے درمیان تجارتی اور اقتصادی ملاقاتوں میں معاونت کرنا، سیاسی مسائل حل کرنے کے لیے سرکاری ترجمان کے طور پر ملکی نمائندگی کرنا بھی سفارت خانے کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔ پردیس میں پاکستانی سفارت خانہ ایک ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں سبز ہلالی پرچم پاکستانیوں کی آنکھوں کو ٹھنڈک ضرور بخشتا ہے۔ لندن میں پاکستانی ہائی کمیشن بھی دیگر ممالک میں سفارت خانوں کی طرح اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔ بعض اوقات یہاں ثقافتی اور تعلیمی و ادبی سرگرمیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ عید ملن پارٹی، چاند رات پر خصوصی سٹال، کتابوں کی رسم اجراء وغیرہ کے انعقاد سے یہاں مقیم کمیونٹی کو صحت مند سرگرمیوں میں آپس میں ملنے کا موقع ملتا ہے۔ قومی تہواروں، افطار ڈنر، مشاعروں، ثقافتی میلوں ادبی محفلوں اور دیگر تقریبات میں بھی بعض اوقات سفارتی عملہ شرکت کر کے حکومتی نمائندگی بھی کر دیتا ہے۔ یہاں مقیم پاکستانیوں کو کسی نہ کسی کام سے سفارت خانے کا دیدار کرنا ہی پڑ جاتا ہے۔ اللہ رب العزت نے ستمبر میں مجھے بیٹے کی نعمت سے نوازا۔ گزشتہ دنوں میں نے بچے کا پاسپورٹ بنانے کے لیے جرمن سفارت خانے سے وقت لیا۔ بروز جمعہ 8 بجکر 45 منٹ پر میں اپنے طے شدہ وقت پر بیوی بچے سمیت جرمن سفارت خانے داخل ہو گیا۔ 22 پاؤنڈز پاسپورٹ فیس جمع کروائی اور 20 منٹ میں بچے کا پاسپورٹ ہمارے حوالے کر دیا گیا۔ جرمن سفارت خانے سے پاکستانی ہائی کمیشن کا پیدل فاصلہ 5 منٹ کا ہے۔ ہم 9 بجکر 20 منٹ پر پاکستان ہائی کمیشن پہنچ گئے جہاں دفتری اوقات 10 بجے شروع ہونے تھے۔ بچپن میں پاکستان میں اگر کوئی صبح دیر سے جاگتا تو اسے یہ طعنہ دیا جاتا تھا کہ کیسے دوپہر تک گوروں کی طرح سویا ہوا ہے۔ مگر گوروں کے دیس میں آ کر پتہ چلا کہ گورے صبح سویرے کام کاج پر ایسے دوڑتے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کو اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ کس نے کیا پہنا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ مشترکہ ہندوستان میں اُنکے سونے کے اوقات ہمارے بزرگوں

نے وہی دیکھے ہوں۔ ایسا منظر میں نے کبھی پاکستان میں گوروں کی بنائی ہوئی ریلوے ورکشاپ کے ملازمین کو کام پر جاتے دیکھا تھا جو مخصوص سائرن بجنے سے پہلے ورکشاپ میں پہنچنے کے لیے دوڑ رہے ہوتے تھے۔ اب نہ وہ ورکشاپ رہی اور نہ ہی وہ لگن، اب تو ورکشاپ کے سائرن کی بھی ریلوے کی طرح بولتی بند ہو چکی ہے۔ پاکستانی ہائی کمیشن لندن کی سب سے خاص بات مخصوص طبقاتی نظام کی جھلک ہے، ایک طرف عالیشان عمارت جس میں وہ لوگ آرام فرما ہیں جن کا کام صرف کام لینا ہے یعنی ''وڈے سرکاری افسر'' دوسری طرف کھلے آسمان تلے خیمہ اور تنگ در و دیوار والی ایک چھوٹی سی عمارت جس میں کام کرنے والے یعنی ''سرکاری بابو'' اور کام کروانے والے یعنی ہم جیسے پردیسی لوگ جن کے پیسوں سے اور جن کی خدمت کے لیے سفارت خانہ بنایا گیا ہے۔ ہائی کمیشن لندن میں استقبالیہ ایک چھوٹے سے کھوکھے (کیبن) کی شکل میں بنایا گیا ہے جہاں پر کوئی انسان نما چیز اس لیے نہیں بٹھائی گئی کہ لوگ اس سے مدد نہ مانگ لیں۔ وہاں پر کیٹیگری کے حساب سے اپنی مدد آپ کے تحت نمبر نکالنا ہوتا ہے۔ ہم نے بچے کا اوریجن کارڈ بنوانا تھا لہذا نادرا والا نمبر لے کر ٹینٹ میں لگی پلاسٹک کی کرسیوں پر بیٹھ گئے جو شدید سردی کی وجہ سے اس بات پر بہت خوش ہوتی نظر آ رہیں تھیں کہ چلو کسی کے بیٹھنے سے میری ٹھنڈ تو ختم ہوئی۔ جیسے جیسے ہجوم بڑھتا گیا سردی کا احساس کم ہونا شروع ہو گیا۔ جرمنی میں کرسمس کے موقع پر چار ہفتوں کے لیے کرسمس مارکیٹس ہر شہر کے وسط میں لگائی جاتیں ہیں، یہ عارضی مارکیٹس خیموں اور کیبنز (کھوکھے) پر مشتمل ہوتیں ہیں مگر وہاں پر سردی کی شدت کم کرنے کے لیے ہیٹرز لگائے جاتے ہیں، یورپ اور برطانیہ میں سنڈے مارکیٹس کی طرز تعمیر بھی اسی قسم کی ہوتی ہے مگر ہمارا پاکستانی ہائی کمیشن لندن جس نے مستقل بنیادوں پر کام کرنا ہوتا ہے حیرت انگیز بات ہے کہ اس جگہ کو بھی بنیادی سہولیات سے محروم رکھا گیا ہے۔ 10 بجے عملہ آنا شروع ہوا تو پاسپورٹ بنانے والے کاؤنٹر پر موجود ''سرکاری باؤ'' نے سب سے مخاطب ہو کر شدید سردی میں ہیٹر نہ چلنے پر معذرت کی۔ حالانکہ بیچارے کا ہیٹر نہ چلنے میں اپنا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ وہ بھی اسی ٹھنڈ میں ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے کام کرنا شروع ہو گیا۔ ٹینٹ کے نیچے موجود لوگوں کی اکثریت نے کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو پاکستان میں تصور کر کے اپنی باری کا انتظار شروع کر دیا۔ جن کو یہ نہیں معلوم کہ اس ٹینٹ اور تنگ در و دیوار والی عمارت کے ساتھ جو وسیع و عریض عمارت ہے اس میں بیٹھے ''سرکاری افسران بالا'' کے دفتری ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھ کر ڈاؤننگ سٹریٹ والا سرکاری دفتر بھی شرما جائے۔ مگر آفرین ہے ان کے ماتحت کام کرنے والوں پر جو شدید سردی میں بھی عوامی خدمت دل و جان سے کر کے لہو کو گرم رکھے ہوئے ہیں۔ کمپیوٹر نظام آنے کی وجہ سے روایتی سرکاری بابو ہائی کمیشن میں نظر نہیں آتے بلکہ جوان نسل بڑے متاثر کن انداز میں اپنے فرائض انجام دے رہی ہے۔ 90 کی دہائی میں جب مشینی پاسپورٹ پاکستانی قونصل خانے میں نہیں بنتے تھے جرمنی کے شہر فرینکفورٹ میں پاسپورٹ بنوانے کا اتفاق ہوا جہاں فیس جمع کروانے کے لیے کافی دور بینک میں بھیج دیا جاتا تھا۔ روایتی سرکاری باؤ پردیسیوں کو خاصا تنگ کرتے تھے۔ بدعنوانیوں میں ملوث ہونے کی شکایات پر قونصل خانے کے سارے عملے کو تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے بعد نئے عملے کے ساتھ جرمن پولیس آفیسر بھی نگرانی کے لیے لگا دیا گیا۔ شکر ہے پاکستان ہائی کمیشن لندن میں فیس قونصل خانے میں ہی جمع ہو جاتی ہے اور سرکاری عملہ اپنے وسائل سے بڑھ کر عوام سے تعاون کر رہا ہے۔ میں نے اپنی اہلیہ کا نیا پاسپورٹ بھی گزشتہ ہفتے بننے کے لیے دیا تھا جو ارجنٹ فیس 52.50 پاؤنڈز جمع کروانے کے باوجود تین ہفتے بعد ملے گا۔ پاسپورٹ بننے

کی اطلاع باقاعدہ موبائل پر ایس ایم ایس کرکے دی گئی۔ اس کے برعکس صرف 22 پاؤنڈز میں بچے کا جرمن پاسپورٹ بیس منٹ بعد میرے ہاتھ میں تھا۔ حیرانگی ہے پاکستانی پاسپورٹ کی قدر تو نہیں مگر قیمت (فیس) اتنی زیادہ۔ کاش گرین پاسپورٹ کی قدر بھی اس کی قیمت کی طرح بڑھ جائے۔ جب تک حقوق کی تقسیم منصفانہ اور مساویانہ نہیں ہوگی، طبقاتی نظام ختم نہیں ہوگا، افسر شاہی سے جان نہیں چھوٹے گی تب تک ہمارے پاسپورٹ کی قدر ہو بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ ایک مخصوص طبقہ جو حقیقت میں اقلیت میں ہے مگر اُس نے اکثریتی مزدور اور محنت کش طبقے کو "اقلیتی" بنا رکھا ہے۔ جب گھر والے قدر کریں گے تو باہر والے بھی عزت دیں گے۔ پاکستانی ہائی کمیشنر واجد شمس الحق سمیت دیگر ووڈے سرکاری افسران بالا اگر کبھی کبھار طبقاتی حصار توڑ کر اپنی سرکاری آرام گاہ سے نکل کر اپنے ورکرز اور جنتا کا حال احوال ہی پوچھ لیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ وہ "نکے" افسر جو شدید سردی میں بھی اپنی حلال روزی کیلئے حلال ہو رہے ہیں، انہیں بھی شفقت اور احترام کی ضرورت ہے لیکن شاید افسر بنانے کے عمل میں اکیڈیمیاں انسانیت سے متعلقہ ہر جذبے کو نکال لیتی ہیں۔

تحریر: سہیل احمد لون

سربٹن۔سرے

sohailloun@gmail.com

08-12-2012.